R. No. 218087

Regd. No, 928

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Tele. No. 20

Telegrams

[illegible]

[illegible]

جلد ۲۲ - شمارہ ۲۲ | ایڈیٹر - آل احمد سرور | ۸ جون ۱۹۶۳ء

مولانا ابوالکلام کے دو قدیم خط

مولانا ابوالکلام کا قیام اپنے ابتدائی زمانہ میں کوئی دو برس جم کر مولانا شبلی کے ساتھ ندوہ میں رہا۔ الندوہ میں مضمون نگاری انھوں نے اسی زمانے میں کی اور اس وقت یہ ایک بڑی امتیازی چیز تھی۔ بلکہ الندوہ کا ایک نمبر تو کُل چاہیے انھیں کا مرتب کیا ہوا ہے۔ گو ضابطہ سے اس کے نائب مدیر مولانا عبدالسلام اور مولانا سید سلیمان ہی رہے۔ اور وہ بھی کئی سال بعد کو۔ اس مسلسل قیام کے بعد مولانا لکھنؤ سے چلے گئے۔ لیکن اس کے دو چار سال بعد سے اُن کا سفر لکھنؤ اکثر ہونے لگا اور قیام بھی شروع شروع مولانا شبلی ہی کے ہاں ہوتا رہا۔ اس طرح ندوہ اور ندوہ والوں سے ربط کے موقع بڑے طویل عرصہ تک حاصل رہے۔ اسی دور کے ایک طالب علم ضلع بارہ بنکی کے مولوی عبدالباری تھے جو آج ماشاءاللہ اشرفیات پر متعدد کتابوں کے مصنف ۔ ۔ ۔ ۔ ہیں۔ مولانا آزاد کے ان کے تعلقات ایک حد تک بے تکلفی کے اسی زمانے میں قائم ہوگئے تھے۔ چنانچہ مولانا کے دو مختصر خط جو بچے کھچے ان کے پاس پڑے رہ گئے تھے ان سے مانگ کر درج ذیل کیے جاتے ہیں۔

(صدق جدید)

(۱)

۱۳ میکلاوڈ اسٹریٹ[1] کلکتہ

صدیقی المحب۔ جس دن مولانا[2] پہنچے۔ اسی دن سے بیکار رو

معطل محض [ہوں] مچھلی کا ایک کانٹا دل کی جگہ حلق میں چبھ گیا۔ عرصے کی تکالیف شاقہ و استعمال آلات متعددہ کے بعد اترا۔ مگر اپنی یادگار چھوڑ گیا۔ سارا حلق زخمی ہو رہا ہے۔ نہ گفتگو کر سکتا ہوں نہ کھا پی سکتا ہوں۔ افسوس کہ مولانا کی تشریف آوری سے کچھ مستفید نہ ہو سکا۔ آپ کی نسبت مولانا نے گفتگو کی تھی۔ لکھا ہوگا یا لکھیں گے بہتر تو یہ ہے کہ ارادہ کو فلسفہ نہ بنائیے۔ اس قدر رکد و کاوش کی کیا ضرورت۔ پڑھنا ہے تو کلکتہ چلے آئیے انتظام ہو ہی جائے گا۔[1]

مسٹر عبدالماجد صاحب کی خدمت میں سلام پہنچے۔

ابوالکلام

(۲)

۱۳ میکلاوڈ اسٹریٹ کلکتہ

$\frac{12}{2}$ ۲

مجبی الصدیق

مرحمت نامہ پہنچا۔ اب فی الجملہ آرام ہے۔ والحمدللہ علیٰ احسانہٖ۔

مولانا شبلی سے مشورہ کے بعد ایک آخری رائے قائم کیجیے۔

ابوالکلام

---

[1] الہلال ابھی تک طلوع نہیں ہوا تھا اور مولانا کا قیام میکلاوڈ اسٹریٹ پر تھا۔ (صدق)

[2] مراد مولانا شبلی ہیں (صدق)

[1] مولوی عبدالباری صاحب کا ارادہ اس وقت کلکتہ جا کر انگریزی پڑھنے اور کسی اسکول میں داخل ہونے کا تھا۔ مولوی صاحب نے اپنی محتاط طبیعت کے مقتضا سے شقیں بہت سی قائم کی تھیں اور اپنے قیام و طعام وغیرہ سے متعلق سوالات کیے تھے (صدق)

[2] اس پر تاریخ درج نہیں، ڈاک خانہ کی مہر میں روانگی کی تاریخ یکم فروری ۱۹۱۳ء (صدق)

بشیر الحق دسنوی

نوادرِ اقبال کے مرتب سے دو دو باتیں

نوادرِ اقبال کے مرتب جناب عبد الغفار شکیل صاحب نے سب سے پہلے اس کتاب میں اقبالؒ کی ۳۱ غزلوں کو جمع کر دیا ہے (ص ۲۷ تا ص ۱۰۶)۔ غزل نمبر ۱ سے

کیا مزا بلبل کو آیا شکوۂ بے داد کا
ڈھونڈتی پھرتی ہے اڑ اڑ کر جو گھر صیاد کا

کے متعلق موصوف نے لکھا ہے کہ اس غزل کی تصنیف (نومبر ۱۸۹۳ء) کے وقت اقبالؒ کی عمر کوئی اٹھارہ برس کی تھی۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ علامہ اقبال کی پیدائش ۱۸۷۳ء کے شروع میں ہوئی تھی۔ اس حساب سے موصوف کی عمر اس وقت (نومبر ۱۸۹۳ء) تقریباً اکیس سال کی تھی۔

غزل ۲ سے

جان دے کر تمھیں جینے کی دعا دیتے ہیں
پھر بھی کہتے ہو کہ عاشق ہمیں کیا دیتے ہیں

اور غزل ۳ سے

آب تیغ یار نے تھوڑا سا لے کر رکھ دیا
باغ جنت میں خدا نے آب کوثر رکھ دیا

کے متعلق مرتب کا یہ دعا کہ یہ دونوں غزلیں علامہ اقبال نے طرحی مشاعرہ کے مصرع طرح پر کہی تھیں اور بعد کو گلدستہ زبان دہلی میں شائع ہوئیں غلط ہے۔

مولانا عبد الرحمن راسخ دہلوی کی ادارت میں ۱۱ جنوری ۱۸۸۲ء سے ایک ہفتہ وار اخبار "چلتا پرزا" کے نام سے محلہ حبش خاں دہلی سے نکلنا شروع ہوا تھا جو کئی سال تک نکلتا رہا۔ اس اخبار کے مالک میر حسین رضوی تھے اور اخبار مطبع رضوی میں چھپتا تھا۔ اسی اخبار کے دفتر سے راسخ صاحب طرحی اور غیر طرحی غزلوں کا ایک گلدستہ "زبان دہلی" کے نام سے نکالتے تھے۔ حضرت داغ دہلوی اس گلدستے کے سرپرست اور مربی تھے اور وہ اپنے شاگردوں کو ہدایت کیے ہوئے تھے کہ اپنی اپنی غزلیں اشاعت کے لیے زبان دہلی کو بھیجیں۔ یہ بات حضرت داغ کے خطوط بنام حضرت احسن مارہروی اور بیخود دہلوی سے ظاہر ہے۔ گلدستہ زبان دہلی میں ہر مہینے طرح دی جاتی تھی اور اسی طرح پر شعرا غزلیں تصنیف کر کے اشاعت کے لیے بھیج دیتے تھے۔ شیخ محمد اقبال حضرت داغ دہلوی کے شاگرد تھے اسی لیے وہ اپنی غزل اشاعت کے لیے زبان دہلی کو بھیج دیتے تھے۔ زبان دہلی کے دو چار نمبر الاصلاح لائبریری دسنہ میں محفوظ تھے۔ مندرجہ بالا تینوں غزلیں وہیں سے حاصل کر کے میں نے رسالہ آج کل دہلی میں چھپوا دی تھیں۔ انھیں غزلوں کو مرتبین سرود رفتہ اور نوادر اقبال "زبان دہلی" کا حوالہ دے کر شائع کر چکے ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگوں کو زبان دہلی کے یہ پرچے کہیں سے نہیں ملے۔ زبان دہلی میں ان غزلوں کے ساتھ اس بات کی صراحت نہیں درج ہے کہ اقبالؒ نے طرحی مشاعرہ کے مصرع طرح پر ان غزلوں کو کہا تھا۔

مہربانی فرما کر شکیل صاحب "ہماری زبان" کے ذریعے مطلع فرمائیں کہ ان کی اطلاع کا کون سا ذریعہ ہے جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ غزل ۲ اور ۳ مشاعرے کی غزلیں ہیں۔

ہماری زبان

۸ رجون ۱۹۶۳ء

رسالہ سائنس

انجمن کی ادبی مجلس نے یہ سفارش کی تھی کہ رسالہ سائنس دوبارہ جاری کیا جائے۔ مجلس عام نے یہ تجویز منظور کرلی۔ اس سلسلے میں ضروری انتظامات ہو رہے ہیں اور توقع ہے کہ اکتوبر سے یہ رسالہ شایع ہونے لگے گا۔

انجمن کی شروع سے یہ کوشش رہی ہے کہ اردو کے علمی سرمائے کو وسعت دی جائے۔ رسالہ سائنس اس سلسلے کی ایک کڑی تھی جسے عرصہ ہوا بعض مجبوریوں کی بنا پر حذف کرنا پڑا تھا۔ اب انجمن نے یہ محسوس کیا کہ اس ضروری کام کو زیادہ عرصے تک ملتوی نہیں کیا جا سکتا۔ ابھی علی گڑھ اور حیدرآباد میں ایسے اشخاص موجود ہیں جو اردو میں سائنس کے مختلف شعبوں پر اعلیٰ درجے کے مضامین لکھ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسری جگہوں پر بھی لکھنے والے مل سکتے ہیں۔ انجمن ان سب سے رابطہ قائم کرکے ان کا تعاون حاصل کرنا چاہتی ہے۔

موجودہ دور میں ایک طرف عام اردو داں حضرات کو سائنس کی معلومات سے آشنا کرنے کا سوال ہے۔ دوسری طرف ایسے لکھنے والوں کی ایک صف تیار کرنی ہے جو اپنے دائرے میں جدید علوم کے تازہ ترین انکشافات اردو میں منتقل کر سکتے ہوں۔ اگرچہ اس وقت سائنس کے علوم زیادہ تر انگریزی میں پڑھائے جا رہے ہیں، مگر رفتہ رفتہ علاقائی زبانوں میں ثانوی تعلیم عام ہوتی جا رہی ہے اور یونیورسٹی کی منزل پر بھی یہ سوال پیدا ہو رہا ہے۔ ہمیں اس سلسلے میں پوری تیاری کرنی ہے تاکہ اردو میں تعلیم کا انتظام ہونے کے بعد کتابوں کی ضرورت نہ پڑے۔ دوسرے یہ بھی طے ہے کہ انگریزی میں نصابی کتابوں کے علاوہ اردو میں عام فہم سائنسی معلومات پیش کرنے سے طلبا کو فائدہ ہوگا۔ ہمیں امید ہے کہ رسالہ سائنس اس طرح اردو داں طبقے کی معلومات سائنس کے متعلق بڑھائے گا۔ سائنس کے طلبا کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے راہیں کھولے گا اور ہمارے عالموں اور اساتذہ کو یہ احساس دلائے گا کہ اپنی زبان کو مالا مال کرنے کی کوشش میں انھیں مدد کرنی چاہیے۔ اس سلسلے میں ہماری زبان کے پڑھنے والے اگر کچھ مشورے دیں تو ان پر غور کیا جائے گا۔

سرزمین

آج کل اشتہاریت ادب میں بھی سرایت کر گئی ہے۔ جسے دیکھیے نہ صرف اردو کا بلکہ ہندوستان کا عظیم شاعر، ادیب یا نقاد ہے۔ کچھ لوگوں کے لیے یہ تعریف بھی کافی نہیں سمجھی جاتی بلکہ انھیں ایشیا کا سب سے بڑا شاعر، ادیب یا افسانہ نگار کہا جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں بات ادھوری ہے۔ آخر دنیا کا سب سے بڑا ادیب، شاعر یا نقاد کہنے میں کیا جاتا ہے۔ کیوں نہ ہم اس طرح اپنا دل خوش کر لیں اور دوست نوازی کا حق ادا کر دیں۔ رسالوں کے ایڈیٹر صاحبان تو بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ آخر عرفی نے انھیں لوگوں کے لیے تو کہا تھا۔

حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

ادھر اخباروں کی سرخیاں بھی اشتہاریت کا شکار ہوتی جا رہی ہیں۔ کبھی کبھار سرخی بڑی سنسنی خیز ہوتی ہے اور خبر پڑھی جائے تو بات ذرا سی نکلتی ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ سرخی کعبے کی طرف جاتی ہے اور خبر ترکستان کی طرف۔ چاشنی اور چٹخارے کی خواہش جب بڑھ جاتی ہے تو ایسے ہی کرشمے دکھاتی ہے۔ اب واقعہ کی کوئی اہمیت نہیں رہتی، اس کو معنی پہنانا سب کچھ ہو۔

نظر کافی نہیں، نیرنگ نظر سب کچھ ہے

ویسے تو یہ برابری کا دور ہے، مگر برابری کے معنی اب یہ ہو گئے ہیں کہ کچھ چیزیں دوسروں سے زیادہ برابر ہیں۔ مثلاً دستور کے آٹھویں شیڈول میں جن زبانوں کا ذکر ہے وہ سب برابر ہیں، مگر پھر وہ بھی سنسکرت کے برابر نہیں۔ اس لیے سہ لسانی فارمولے پر عمل کرتے وقت جب سنسکرت کا سوال آئے گا تو دوسری زبانیں دھری رہ جائیں گی۔ آخر سنسکرت کو یہ امتیاز تو حاصل ہے کہ وہ کہیں بولی نہیں جاتی، دوسری زبانیں اس کی برابری کیسے کر سکتی ہیں۔ وہ جدید زبانیں ہوا کریں، اس سے کیا ہوتا ہے۔

اردو ادب کا خاص نمبر

انجمن کی ادبی مجلس نے یہ بھی طے کیا ہے کہ اردو ادب کے تین شمارے تو حسب دستور شایع ہوتے رہیں، مگر ایک شمارہ تخلیقی ادب کے لیے وقف ہو۔ شروع شروع میں رسالہ اردو میں عظمت اللہ خاں اور اختر شیرانی کی کچھ نظمیں شایع ہوئی تھیں نیز مغربی شعرا کی بعض نظموں کے ترجمے بھی، مگر یہ سلسلہ بھی جاری نہ رہ سکا۔ اردو ادب نے رسالہ اردو کی روایت کو برقرار رکھا ہے اور اس میں تحقیق و تنقید پر معیاری مضامین شایع ہوتے ہیں۔ رسالے کی یہ خصوصیت ہمیں عزیز ہے، مگر یہ بھی محسوس ہوا کہ تخلیقی ادب کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کر لینا مناسب نہیں۔ اگر ہر پرچے میں ایک حصہ تخلیقی ادب کے لیے وقف ہوتا تو پرچے کا خاص رنگ باقی نہ رہتا۔ اب ہر سال ایک پرچہ نظموں، غزلوں، افسانوں، ڈراموں، انشائیوں اور دوسری زبانوں کے شاہکاروں کے تراجم کے لیے وقف ہوگا۔ فی الحال یہ مناسب معلوم ہوا کہ تیسری سہ ماہی کا شمارہ تخلیقی ادب کے لیے وقف کر دیا جائے۔ ہمیں امید ہے کہ اس اقدام کو پسند کیا جائے گا اور اچھے لکھنے والے اس سلسلے میں ہمارے ساتھ پورا تعاون کریں گے۔ اس نمبر کی تیاری میں ایڈیٹر کے ساتھ جناب حیات اللہ انصاری اور پروفیسر احتشام حسین بھی شریک ہوں گے۔

انجمن ترقی اردو، شاخ چکردھرپور

۲۲ مئی کو بہار ریاستی انجمن ترقی اردو شاخ چکردھرپور کا ایک عام جلسہ جناب ۔۔۔ پرشاد سنگھ ایم۔ ایل۔ اے کی صدارت میں ہوا۔ جلسہ میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ رانچی یونیورسٹی کے ڈگری کالجوں میں اُردو طلبا کی خاصی تعداد ہونے کے باوجود بھی اردو میں ایم۔ اے کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں اس لیے اردو طلبا کو جو اردو میں ایم۔ اے کرنا چاہتے ہیں یا تو انھیں دوسری یونیورسٹی کا سہارا لینا پڑتا ہے یا اپنی خواہش ترک کر دینی پڑتی ہے۔ لہذا ۔۔۔۔۔ یونیورسٹی جلد از جلد اردو میں ایم۔ اے کی تعلیم کا انتظام کرے۔

جلسہ میں سہ لسانی فارمولا پر بھی روشنی ڈالی گئی اور اس کی اسپرٹ کو سراہتے ہوئے مقررین نے اس خبر پر سخت تشویش کا اظہار کیا کہ بعض ریاستوں میں جہاں کی سرکاری زبان ہندی ہے سنسکرت جیسی کلاسیکل زبان کو فارمولا کے تحت لانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ حالانکہ یہ حق صرف اردو کو پہنچتا ہے اس لیے کہ یہی ان ریاستوں کی دوسری بڑی زبان ہے اور سہ لسانی فارمولا کی اسپرٹ کا بھی یہی تقاضا ہے۔

صدر جلسہ نے اپنی مختصر تقریر میں اس پر زور دیا کہ ہندوستان کی تمام زبانوں کو ان کا جائز حق ملنا چاہیے اور کسی زبان کو مٹا کر یا پس پشت ڈال کر دوسری زبان کی ترقی کا جذبہ نہ صرف جمہوری اسپرٹ کے منافی ہے بلکہ قابل مذمت بھی۔ انھوں نے حاضرین جلسہ کو یقین دلایا کہ وہ ان کے مطالبات اسمبلی میں رکھیں گے۔

آخر میں مندرجہ ذیل تجویزیں متفقہ طور سے پاس ہوئیں:

تجویز نمبر ۱: انجمن ترقی اردو شاخ چکردھرپور کا یہ عام جلسہ اردو کے مزاحیہ نگار جناب شوکت تھانوی کے انتقال پر ملال پر دلی رنج و الم کا اظہار کرتا ہے اور اردو ادب کے لیے ایک نقصان عظیم تصور کرتا ہے۔

تجویز نمبر ۲: رانچی یونیورسٹی کے ڈگری کالجوں میں اردو طلبا کی معقول تعداد ہونے کے باوجود اردو میں ایم۔ اے کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں۔ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو شاخ چکردھرپور کا یہ جلسہ عام اس کمی کو شدت سے محسوس کرتا ہے اور یونیورسٹی مذکور کے ارباب حل و عقد نیز وزارت تعلیم حکومت بہار سے پُر زور مطالبہ کرتا ہے کہ جلد از جلد اردو میں ایم۔ اے کی تعلیم کا انتظام کرے۔

تجویز نمبر ۳: جلسہ حکومت کے سہ لسانی فارمولا کو نہایت مناسب اور معقول سمجھتا ہے اور حکومت بہار سے مطالبہ کرتا ہے کہ سہ لسانی فارمولا کی تیسری زبان اردو کو جو ریاست کی دوسری سب سے بڑی زبان ہے تسلیم کرے۔ یہی حق و انصاف کا تقاضا ہے۔

تجویز نمبر ۴: یہ عام جلسہ مناسب سمجھتا ہے کہ اردو میں ایم۔ اے کلاس کے قیام کے سلسلے میں ایک وفد انجمن ترقی اردو بہار کی رانچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی خدمت میں روانہ کرے۔ وفد کو انجمن ترقی اردو شاخ چکردھرپور کی تائید و حمایت حاصل ہوگی۔

(یاسمین عظیم آبادی)

شنکر نگر میں یوم ڈاکٹر زور

منجانب انجمن ترقی اردو شاخ بولا حسن بنام مورخہ ۲۰ مئی ۱۹۹۳ء

شنکر نگر محبوب میں شاندار پیمانہ پر "یوم ڈاکٹر زور" زیر صدارت صلاح الدین حمید منایا گیا۔

مولوی سید عبدالرشید صاحب رنگین نائب صدر انجمن نے آنریبل میر احمد علی خاں وزیر، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، مخدوم محی الدین ممبر لیجسلیٹو کونسل آندھرا پردیش، راجہ جانکی پرشاد، مولوی حبیب الرحمن، مولوی سراج الدین عینی کے پیامات پڑھ کر سنائے۔ اس کے بعد عبدالرحمن جاوید نے ڈاکٹر زور کی پہلی غزل سنائی۔ اور ذریعہ نظم طالب رزاقی و رنگین داحسن جعفری و زاہد رشیدا نانڈیڑی اور ذریعہ مضمون رفیق احمد منصف و صابر علی اور ذریعہ تقریر محمود علی خاں صدر مدرس شنکر نگر ہائی اسکول و محمد شرف الحسن ایڈوکیٹ نے خراج تحسین پیش کیا۔ ہر بندر کمار استھانہ و شبیر علی شاہ نے اصلاحی افسانے سنائے۔

طالب رزاقی، منصف، ساغر حیدرآبادی، ارشد مرزا، راشد احسن جعفری، الکلیم قریشی، عادل، ظریف نے اپنا کلام سنایا جسے حاضرین جلسہ نے پسند کیا۔ عبدالرحمن جاوید نے ڈاکٹر زور صاحب پر آخری نظم سنائی۔ آخر میں غلام محمد مصطفیٰ ساغر حیدرآبادی معتمد انجمن نے حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے عوام سے اپیل کی کہ ڈاکٹر زور کے نظریات کو روبعمل لایا جائے۔ اور ان کو ترقی دینے کے لیے زیادہ سے زیادہ تعداد میں انجمن کے رکن بن کر دامے، درمے، سخنے انجمن کی امداد فرمائیں۔ یہ جلسہ کامیابی کے ساتھ (۲) ساعت شب اختتام کو پہنچا۔ انوار رشید حسینی آرگنائزر۔ حاجی سید عبدالمعین خازن و سید محمد علی نائب نگران کار دارالمطالعہ و محمد عبدالرحیم رشیدا نانڈیڑی نائب نگران کار شعبۂ نظم کا حسن انتظام قابل ستائش رہا۔ (ساغر حیدرآبادی معتمد انجمن)

سمری بختیارپور میں علاقائی شاخ انجمن ترقی اردو کی کانفرنس

۹ مئی ۱۹۹۳ء کو سمری بختیارپور میں ایک عظیم الشان علاقائی اردو کانفرنس ہوئی جس میں علاقہ کے اور صوبۂ بہار کے دوسری جگہوں کے دس ہزار سامعین نے پورے ذوق و شوق سے پروگرام میں حصہ لیا۔ کانفرنس تین نشستوں میں منقسم تھی۔ پہلا اجلاس جناب عبدالوحید صاحب مہتمم مدرسہ صلاحیہ مبارک پور کی صدارت میں صبح ۹ بجے قومی ترانے سے شروع ہوا۔ اس کے بعد جناب رمز عظیم آبادی نے اردو کی آپ بیتی حدیث معتبر کے عنوان سے پیش کی اور صدر استقبالیہ علاقائی اردو کانفرنس جناب ظہور الحسن صاحب مبارکپوری نے خطبہ استقبالیہ پڑھا۔ ناظم استقبالیہ جناب ڈی منظور حسن صاحب ندوی نے اپنی رپورٹ پیش کی۔ مولانا اختر الزماں رحمانی نے اردو زبان پر ایک مختصر اور بسیط تقریر فرمائی اور جناب عبدالاحد صاحب محمود بالی چکی صدر مقامی انجمن ترقی اردو نے مقامی حالات کی روشنی میں اردو کی اہمیت اور حکومت کے رویے پر ایک جامع تقریر فرمائی۔

تین بجنے سے پانچ بجے شام تک منعقد ہونے والے جلسہ جس میں تقریباً پچاس مندوبین شریک تھے مختلف تجاویز جن کا تعلق حکومت بہار، مرکزی حکومت اور مقامی حکام سے تھا بالاتفاق آرا مرتب ہوئیں۔ سات بجے شام کو تیسرا اجلاس قومی ترانے سے شروع ہوا۔ ناظم استقبالیہ جناب منظور الحسن صاحب ندوی کی تحریک پر صدارت جناب چودھری صلاح الدین ایم۔ ایل۔ اے نے قبول فرمائی۔ سب سے پہلے مجلس مضامین کی مرتب شدہ تجاویز پیش کی گئیں۔ ان پر تائیدی تقریریں ہوئیں۔ آخری تقریر جناب غلام سرور صاحب کی ہوئی۔ کانفرنس کے بعد شری واسدیو بابو کی صدارت میں ساڑھے ۹ بجے سے ۴ بجے رات تک کامیاب مشاعرہ ہوتا رہا۔

فضا ابن فیضی

تلوار اٹھا

فتنۂ گیسو و رخسار کو آواز نہ دے
ابھی پازیب کی جھنکار کو آواز نہ دے
ٹھہر جا نغمۂ غزل بار کو آواز نہ دے
صحنِ گلزار سے فن کار کو آواز نہ دے
پھول چننے کا یہ موسم تو نہیں، خار اٹھا
توڑ دے جام و سبو، ہاتھ میں تلوار اٹھا

شاخ کا پھول بھی دہکا ہوا انگارا ہے
جو نفس بھی ہے وہ اک خون کا فوارا ہے
خلوتِ عیش کہاں، موت کا گہوارا ہے
اس نظارے کا نگاہوں کو کہاں یارا ہے
بزمِ مستی سے بسا جالب و رخسار اٹھا
توڑ دے جام و سبو، ہاتھ میں تلوار اٹھا

تو نے اکثر کیے تلوار کے پانی سے وضو
برق دیتی ہے گلستاں کو ترے درس نمو
رگِ کہسار میں ہے تیرے ہی تیشے کا لہو
قصرِ شیریں سے نکل، توڑ دے خسرو کا سبو
جاگ اٹھیں شہر، وہ طوفانِ سرِ کہسار اٹھا
توڑ دے جام و سبو، ہاتھ میں تلوار اٹھا

برق بیتاب ہے تو، ابر کی چلمن سے نکل
بن کے طوفاں کبھی دریاؤں کے آغوش میں ڈھل
آگ گلزار بھی ہو سکتی ہے اس آگ پہ چل
جرأت آموز بن آغوشِ حوادث میں مچل
مسکراتے ہوئے رنجِ رسن و دار اٹھا
توڑ دے جام و سبو، ہاتھ میں تلوار اٹھا

تجھ سے خود راستہ منزل کی نشانی مانگے
تیری رفتار سے دریا بھی روانی مانگے
حوصلوں سے ترے کہسار جوانی مانگے
برق اچھوں سے تری شعلہ فشانی مانگے
کون بن کر تری غیرت کا خریدار اٹھا
توڑ دے جام و سبو، ہاتھ میں تلوار اٹھا

بحر و صحرا کو کھنگالا ہے تری ہمت نے
آگ میں کھیلنا سیکھا ہے تری ہمت نے
موت کو گود میں پالا ہے تری ہمت نے
وقت کو حوصلہ بخشا ہے تری ہمت نے
آن رہ جائے وطن کی سرِ پندار اٹھا
توڑ دے جام و سبو، ہاتھ میں تلوار اٹھا

تیرگی، صبح کی تقدیر نہ ہونے پائے
مضمحل، خواب کی تعبیر نہ ہونے پائے
موجِ گل بستۂ زنجیر نہ ہونے پائے
قید یہ آہوئے کشمیر نہ ہونے پائے
لے کے پیغامِ جنوں، عشق خبردار اٹھا
توڑ دے جام و سبو، ہاتھ میں تلوار اٹھا

گو تم و کرشن کے مسکن کے قریب آ پہنچے
شعلے تہذیب کے خرمن کے قریب آ پہنچے
ہاتھ بجلی کے نشیمن کے قریب آ پہنچے
خارِ صحرا، ترے دامن کے قریب آ پہنچے
دیکھنا پھر کوئی فتنہ پسِ دیوار اٹھا
توڑ دے جام و سبو، ہاتھ میں تلوار اٹھا

قصرِ اردو کے محل کو ضرورت ہے تری
عظمتِ تاج و اجنتا کو ضرورت ہے تری
قطب مینار و ہمالا کو ضرورت ہے تری
آج پھر مشرقِ عظمیٰ کو ضرورت ہے تری
آنکھ سے حسنِ تمدن کے پرستار اٹھا
توڑ دے جام و سبو، ہاتھ میں تلوار اٹھا

بزم میں آج تو ذکرِ رسن و دار چلے
دیر تک سلسلۂ گرمیٔ گفتار چلے
یوں چلیں آج قلم جیسے کہ تلوار چلے
جس طرف میں چلوں اک محشرِ بیدار چلے
اپنے ہی خون کا تشنہ ہے جو فتنہ وہ اٹھا
توڑ دے جام و سبو، ہاتھ میں تلوار اٹھا

غزلیں

ایس ذوالحسن انور ادیب

دور سے مسکرا کے دیکھ لیا — دل جلوں کو جلا کے دیکھ لیا
درد و غم کا کوئی نہیں ساتھی — ہم نے خوب آزما کے دیکھ لیا
ان پہ کچھ اثر نہ ہوا — قصۂ غم سنا کے دیکھ لیا
آگ الفت کی بجھ نہیں سکتی — ہم نے اس کو بجھا کے دیکھ لیا
انور ہم نے بھی دخترِ رز کا مزہ — پی کے دیکھا پلا کے دیکھ لیا

ظہیر عظمت

چراغ بن کے کہاں تیری انجمن میں ہے — رکی بھی سانس تو راہوں کو [illegible]
اگرچہ ہم بھی قفس میں گزار لے ہیں — گزر یوں جیسے قفس میں [illegible]
نہ جانے کیا خیال آیا انھیں کہ ساتھ رہے — ہر ایک مرحلہ کو حوصلہ [illegible]
وہ کیف بخشے ہے تنہائیوں نے اے عظمت — کہ جیسے کوئی ستارہ [illegible]

ممتاز راشد اجمیری

دل میں نفرت کا یقیں، عزم کا چہرہ دل پہ جلال
جانب دار و رسن یوں تیرے دیوانے چلے
فاصلہ صحنِ گلستاں کا کبھی طے نہ ہوا
ہم تو جس سمت چلے ساتھ ہی ویرانے چلے

مراسلات

شاہ نیاز سرہندی کا اردو دیوان

۲۲ مئی کے "ہماری زبان" میں ڈاکٹر قمر رئیس کا مکتوب تاشقند شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے شاہ نیاز بریلوی کے اس دیوان کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے جو تاشقند کے ایک کتب خانے میں محفوظ ہے اور جس میں شاہ نیاز کا اردو کلام بطور ضمیمہ کے درج ہے۔

یہ مخطوطہ سب سے پہلے غالباً ڈاکٹر اشرف مرحوم نے دیکھا تھا اور انہوں نے سید سجاد ظہیر کے بیان کے مطابق اس مخطوطے پر ایک نوٹ بھی لکھا ہے۔

ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق "دیوان شاہ نیاز" (فارسی اردو) سب سے پہلے غالباً ۱۸۴۹ء میں مطبع قادری (آگرہ) سے شائع ہوا تھا۔ اس وقت پانچ سو کی تعداد میں یہ دیوان چھپا تھا، اور اس کی قیمت ایک روپیہ تھی (دیکھئے راقم الحروف کی حالیہ مطبوعہ تالیف "صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات" ص ۱۵۰)

محمد عتیق صدیقی

(۲)

ڈاکٹر قمر رئیس صاحب نے تحریر فرمایا ہے "اگر شاہ نیاز سرہندی کا اردو کلام اب تک اردو میں شائع نہیں ہوا ہے تو پھر جس طرح بھی ہوگا میں اسے مرتب کر کے پیش کرنے کی کوشش کروں گا"

اطلاعاً عرض ہے کہ حضرت شاہ نیاز رحمۃ اللہ علیہ کا دیوان اردو فارسی بار بار اور متعدد مطابع سے شائع ہوا ہے اور غالباً آخری بار حضرت مزمل خاں سرحدی ساکن خانقاہ نیازیہ بریلی نے میری معرفت آگرہ اخبار پریس آگرہ سے چھپوایا تھا اس وقت یہ دیوان میرے سامنے نہیں اس لئے صحیح سنہ طباعت عرض نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ یہ دیوان ۱۹۳۰ء کے بعد طبع ہوا ہے اور اس کے ٹائٹل پیج کے آخری صفحے پر مطبع والوں نے باقیات فانی کا اشتہار شائع کیا تھا۔

اس وقت دو دیوان میرے کتب خانے میں مجھے مل سکے ہیں جس میں ایک نولکشور پریس میں ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا ہے اور دوسرا سنٹرل پریس الٰہ آباد کا چھپا ہوا ہے جس پر سنہ طباعت درج نہیں ہے لیکن یہ بات یقینی ہے کہ یہ دیوان بھی ۱۹۳۰ء سے پہلے کا ہے کیونکہ اس کے شروع کے سادہ صفحوں پر والد ماجدؒ کے ہاتھ کی ایک غزل لکھی ہوئی تھی جو اب شکستہ ہو گئی ہے اور جو کسی صوفی شاعر کی ہے اور ایک زمانے میں بہت مشہور غزل رہی ہے۔ دو شعر عرض ہیں۔

مجھے دعویٰ کا ہوا ہے میں نہیں ہوں ۔۔۔ کسی کا شعبدہ ہے میں نہیں ہوں

قبا پہنے ہوئے مٹی کی رنگت ۔۔۔ کوئی بہروپیا ہے میں نہیں ہوں

حضرت شاہ نیاز رحمۃ اللہ ہندوستان کے معروف ترین صوفیوں اور شاعروں میں ہیں آپ کا مولد سرہند ہے لیکن اوائل عمری سے دہلی میں تشریف لے آئے تھے۔ اور عمر کا بیشتر حصہ اگرچہ دہلی اور بریلی میں گزرا۔ آگرے کا قیام سننے میں نہیں آیا۔ معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب کی اس اطلاع کا ماخذ کیا ہے۔ حضرت شاہ نیازؒ حضرت مولانا فخر الدین دہلویؒ کے اجل خلفا میں اور حضرت کے قائم مقام شمار کئے جاتے ہیں حضرت شاہ نیازؒ کے مریدین و خلفا کی تعداد لاکھوں سے متجاوز رہی ہے جن کی کثیر تعداد بیرون ہند سرحد، کابل، بدخشاں، سمرقند وغیرہ میں تھی اور اب بھی اس اطراف کے اکثر مقامات پر حضرت کے سلسلے کی خانقاہیں ہیں اور رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری ہے وہاں کے بعض اہل سلسلہ اور مشائخ کو میں نے خود دیکھا اور ان کی صحبتوں سے لطف اندوز ہوا ہوں۔ اس کے علاوہ آج بھی کوئی عرس اور قوالی کی محفل ایسی نہیں ہوتی جہاں حضرت کی غزلیں قوال نہ گاتے ہوں۔ اسکے باوجود اگر آب حیات اور دوسرے مستند تذکروں میں حضرت کا تذکرہ نہیں ہے۔ تو اسے تذکرہ نگاروں کی روشن ضمیری کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ معمہ بھی شاید ماہرین نفسیات ہی حل کر سکیں کہ مورخین کے رد و قبول کے عوامل ذہنی کس طرح متاثر ہوتے اور کام کرتے ہیں۔

ڈاکٹر قمر رئیس صاحب نے حضرت کے جو اشعار نقل کئے ہیں ان میں پہلا مطلع دیوان ہے لیکن ہندوستان کے مطبوعہ دیوانوں میں یہ مطلع اس طرح پایا جاتا ہے۔

گر کون و مکاں مظہر نیرنگ نہ ہوتا ۔۔۔ ہر آن میں اس کا یہ نیا ڈھنگ نہ ہوتا

یعنی "اپنا نیا" کے بجائے "اسکا یہ نیا" ہے۔

(میکش اکبرآبادی)

(۳)

شاہ نیاز سرہندی کے فارسی اور اردو کلام کا مجموعہ بصورت دیوان کئی مرتبہ شائع ہو چکا ہے موجودہ دیوان بڑے سائز کے ۱۰۰ صفحوں پر فروری ۱۹۳۶ء میں نولکشور پریس لکھنؤ سے طبع ہونے والا بارھواں ایڈیشن ہے۔

ڈاکٹر قمر رئیس صاحب نے ۱۹۰۶ء میں ازبک کاتب کے روسی کاغذ پر نقل کئے ہوئے جس نسخے کا حوالہ دیا ہے وہ ہندوستان کے کسی مطبوعہ دیوان کی نقل یا انتخاب ہو سکتا ہے کیونکہ ۱۹۰۶ء تک اس دیوان کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہونگے مگر ان کی تاریخ طباعت کا ذکر بارھویں ایڈیشن میں نہیں کیا گیا۔

اس دیوان کے فارسی اور اردو اشعار کے مطالعہ سے یہ تصدیق ہو جاتی ہے کہ واقعی حضرت شاہ نیاز بڑے مرتبے کے صوفی شاعر اور بزرگ تھے۔

آپ کے والد حضرت حاجی حکیم شاہ رحمت اللہ صاحب سرہندی کا مولد سرہند تھا ...... آپ یعنی (شاہ نیاز) ظاہری و باطنی تحصیل علوم حضرت مولانا محمد فخر الدین صاحب چشتی نظامی دہلوی کے عہد میں دہلی میں پائی تھی بستر یا اٹھارہ سال کی عمر میں علوم ظاہری سے فارغ ہوکر دستار فضیلت فرق مبارک پر باندھی اور انیس برس کی عمر میں مولانا محمد فخر الدین کے دست مبارک پر بیعت کی اور اپنے پیر و مرشد کے حکم کی تعمیل میں بانس بریلی آکر قیام فرمایا۔

اس کے بعد رام پور جاکر حضرت غوث الاعظمؒ کے فرزندوں میں سے ایک بزرگ شاہ عبداللہ صاحب بغدادی کی بیعت سے مشرف ہوئے۔ اور اس طرح خاندان قادریہ میں منسلک ہو کر

چشتی و قادری کہلائے۔

تاریخ ۱۰ جمادی الثانی ۱۲۵۰ھ ہجری کو ۹۰ برس کی عمر پاکر بانس بریلی میں آپ کا وصال ہوا۔ وہیں مزار ہے اور سالانہ عرس ہوتا ہے۔ اکثر کابلی، شیرازی اور بدخشانی ارادت مند آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر مرید ہوئے اور ان میں سے بعض حضرات اپنے وطن میں پہنچ کر خود رشد و ہدایت کرنے لگے۔

دیوان نیاز میں صفحہ ۲ تا صفحہ ۴۱ پر فارسی کی ۹۳ غزلوں کے آٹھ سو سے زیادہ اشعار ہیں۔ اس کے بعد تین فارسی مثنویاں ہیں۔ دو مستزاد اور منشی اصغر علی کی ایک مشہور غزل ......

مست گشتم از دو چشم ساقی پیمانہ نوش
الفراق اے ننگ و ناموس الوداع اے عقل و ہوش

اور آخر میں ایک طویل مناجات ہے۔

اس دیوان کا صفحہ ۴۲ سے ۹۵ تک اردو کلام کے لئے مخصوص ہے اور اردو کی ۹۲ غزلیں کم و بیش چار سو اشعار پر مشتمل ان اوراق کی زیب و زینت ہیں۔ اس کے بعد چھوٹی بڑی بارہ رباعیاں اور ایک چھاچی بھی شریک اشاعت ہے۔ اردو غزلوں میں وہ غزلیں بھی موجود ہیں جن کا ذکر ڈاکٹر قمر رئیس نے مقالے میں کیا ہے۔ شاہ نیاز سرہندی کا فارسی اور اردو کلام آسان سادہ زبان اور دلچسپ طرز اسلوب کا اچھا نمونہ ہے۔ دیوان میں متن کے علاوہ ہر صفحے کے حاشیے پر بھی مسلسل کلام بطرز قدیم چھپا ہے۔

شاہ نیاز کی وفات پر ایک ایرانی شاعر نے ذیل قطعہ میں تاریخ وفات لکھ کر بھیجی تھی جو فارسی کلام کے خاتمے پر درج کی گئی ہے۔

شہ نیاز احمد امام اہل راز — کاشف رمز حقیقت ہم مجاز
آنکہ چون پروانہ در بزم شہود — داشتہ ہم چوں شمع روز و شب گداز
در شریعت بود ماہ برج دیں — بر سپہر طریقت شاہباز
ناگہاں آمد ندائے ارجعی — گوش فرمود از جناب کارساز
روح پاک او بعلیین نشست — در مقام قرب حق بر فرش ناز
از جمادی دوم بد ششمیں — کہ سوئے خلد بریں آمد فراز
سال وصلش ہاتفی گفتا زغیب
قطب ایزد شاہ احمد شہ نیاز

(خادم جمیل بریلوی)

(۴)

ڈاکٹر قمر رئیس صاحب کا مکتوب بڑے ذوق و شوق سے پڑھا۔ اطلاعاً عرض ہے کہ شاہ نیاز احمد سرہندی کا اردو دیوان چھپ چکا ہے۔ "دیوان نیاز" کے نام سے اردو فارسی دیوان کا مجموعہ نول کشور نے بہت پہلے شائع کیا تھا۔ میرے پاس ایک چھوٹا پرانا نسخہ ہے جو ۱۹۱۲ء کا چھپا ہے اور جو شاہ نیاز کے دیوان کا نواں ایڈیشن ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے نقل کردہ اشعار میں کچھ اختلافات ملتے ہیں جنہیں میں یہاں نمایاں کرتا ہوں۔

تاشقندی مخطوطہ :- ہر آن میں اپنا نا نیا ڈھنگ نہ ہوتا
نولکشوری مطبوعہ :- ہر آن میں اسکا نیا ڈھنگ نہ ہوتا

ت - م :- چادر سے موج کے نہ چھپے چہرہ آب کا
برقع حباب کا نہ ہو برقع حباب کا
ن - م :- چادر سے موج کی نہ چھپے چہرہ آب کا
برقع حباب کا نہ ہو برقع حباب کا

ت - م :- اپنا تو ملک دل ہی کبھو سے اجڑ گیا
لیکن چراغ داغ سے گھر ہے بسا ہوا
ن - م :- اپنا تو ملک دل ہے کبھی سے اجڑ گیا
لیکن چراغ داغ سے گھر ہے بسا ہوا

ت - م :- ممکن نہیں جو پھر بنے یہ گھر ڈھا ہوا
ن - م :- ممکن نہیں جو پھر بسے یہ گھر ڈھا ہوا

ت - م :- ہنستا ہے ہوئے خندۂ گل سے شگفتہ دل
ن - م :- ہوتا ہے کوئی خندۂ گل سے شگفتہ دل

ت - م :- اب کیا کرے گا ....
ن - م :- کہو کیا کرے گا ....

ت - م :- نہ کوئی اس کے ما سوا دیکھا
ن - م :- نہ کوئی اس کا ما سوا دیکھا

ت - م :- دید اپنے کی تھی اسے منظور
ن - م :- دید اپنے کی تھی اسے خواہش

ت - م :- تمہارے عارض کے نیچے زلفوں کو دیکھ کر کیا مثال کہیے
ن - م :- تمہارے مکھڑے کے نیچے زلفوں کے دیکھ کر کیا مثال کہیے

مطبوعہ نسخوں کے نکل آنے سے مخطوطہ کی اہمیت کچھ کم ضرور ہو جاتی ہے مگر پھر بھی اس کی کافی اہمیت ہے۔ ضرورت ہے کہ قلمی نسخے کو پورے کا پورا مطبوعہ نسخے سے ملا لیا جائے۔ ہو سکتا ہے مخطوطے میں کچھ نئی غزلیں مل جائیں۔ نئے اشعار مل جائیں۔

(اقبال کرشن)

(۳)

حضرت نیاز بریلی کے ایک بزرگ تھے جن کی خانقاہ یہاں موجود ہے جس کے موجودہ سجادہ نشین عزیز میاں صاحب ہیں۔ اس خانقاہ سے اطراف ہند کے بہت سے لوگ وابستہ عقیدت تھے۔ جن میں بعض والیان ریاست بھی شامل تھے۔ البتہ اب تو حالات اور خیالات نے یہ دنیا ہی بدل دی ہے۔ تاہم اب بھی سالانہ عرس کے موقع پر ملک کے مختلف گوشوں سے عقیدت مند شریک ہوتے ہیں۔

(عبدالواحد)

"قمر زمانی"

متعلق "رسالہ نقاد آگرہ" مطبوعہ اردو ادب شمارہ ۱۔ ۱۹۶۳ء

اس مضمون میں جناب بشیر الحق دسنوی صاحب نے رسالہ نقاد آگرہ کا ذکر کیا ہے۔ اور اسی سلسلے میں قمر زمانی صاحبہ کا تذکرہ اور ان کی عبارت رسالہ نقاد سے نقل کی ہے۔ رسالہ میرے ہی

ملنے سے میرے ہی ایک عزیز نکالتے تھے۔ مجھے اس سلسلے میں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ جہاں تک مجھے علم اور یقین ہے قمر زمانی ایک فرضی نام تھا۔ جو دلگیر شاہ ایڈیٹر نقاد کے چند دوستوں کا طبع زاد تھا۔ اس بارے میں شاہ دلگیر نے نقاد میں جو کچھ لکھا وہ اپنے علم میں صحیح لکھا اور نیک نیتی سے لکھا۔ یہ معاملہ اتنا دلچسپ تھا اور اس غلط فہمی نے اتنا طول کھینچا تھا کہ اس پر پورا ایک ناول لکھا جا سکتا ہے۔ دلگیر شاہ مرحوم کے دوستوں اور احباب میں اس وقت حضرت علامہ نیاز فتحپوری، حضرت مانی جائسی اور حضرات لی ماجد اکبرآبادی اور مخمور اکبرآبادی بفضلہ بقید حیات ہیں اور اس مذاق سے بخوبی واقف ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی شاید اس انکشاف پر آمادہ نہ ہو۔ پاکستان تشریف لے جانے سے پہلے مجھے دہلی میں علامہ نیاز فتحپوری سے نیاز حاصل ہوا تھا ان کے سامنے شاہ دلگیر کے تذکرے میں میری زبان سے قمر زمانی کا نام نکل گیا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں نے غلطی کی مگر نیاز صاحب کا انداز اس وقت ایسا تھا کہ معذرت بھی نہ کر سکا۔

(میکش اکبرآبادی)

پوزیشن مؤنث ہے یا مذکر؟

ہماری زبان مورخہ ۲۲ر مئی ۱۹۶۳ء میں تجلی صاحب عثمانی جے پوری کا استفسار مندرجہ عنوان بالا شائع ہوا ہے اور اس کے ساتھ "ادارہ" کا جواب بھی

اس باب میں یہ عرض کرنا ہے کہ نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی کا یہ مطلع جس سے مستفسر کو دھوکا ہوا ہے۔ پوزیشن کی تذکیر و تانیث سے کلیتہً ساکت ہے ؎

خیال رکھتا ہے جو آدمی پوزیشن کا وہ دل کا داغ سمجھتا ہے داغ دامن کا

"رکھتا ہے" "کیوں آیا"، اس لئے کہ اس کا فاعل آدمی ہے اور "پوزیشن کا خیال" "میں کا" "کیوں آیا"؟ اسلئے کہ خیال مذکر ہے

(مصطفٰی علیگ)

(۲)

ہماری زبان مورخہ ۲۲ر مئی ۱۹۶۳ء میں لفظ پوزیشن مذکر ہے یا مؤنث پڑھا۔

جناب تجلی عثمانی جے پوری کا یہ فرمانا کہ پوزیشن انگریزی لفظ مذکر ہے درست نہیں۔ بہ دلیل کے طور پر فضا کا یہ شعر بھی ؎

خیال رکھتا ہے جو آدمی پوزیشن کا وہ دل کا داغ سمجھتا ہے داغ دامن کا

ظاہر کرتا ہے کہ لفظ پوزیشن نہ مذکر ہے نہ مؤنث۔ کیونکہ مصرع اول میں مذکر خیال محض ہے نا کہ پوزیشن۔ میری رائے میں یہ بحث ہی غلط ہے کیونکہ پوزیشن صحیح طور پر مؤنث ہے۔

(ڈاکٹر راج دید پرکاش)

امرتسر

سہ لسانی فارمولا اور یو پی

وزیر اعظم نہرو کی یقین دہانی اور سہ لسانی فارمولا کو عملی جامہ پہنانے والی کمیٹی کے اس واضح فیصلے کے باوجود کہ سنسکرت کو جو صرف ایک کلاسیکی اور قدیم زبان ہے تیسری لازمی زبان کی حیثیت نہ دی جاوے۔ حکومت اتر پردیش اپنے اس فیصلے پر کہ سنسکرت کو صوبے کے اسکولوں میں جاری کیا جاوے۔ اٹل معلوم ہوتی ہے۔ اطلاع موصول ہوئی ہے کہ ۱۵ر اپریل کے فیصلہ کو نظر انداز کرتے ہوئے محکمۂ تعلیمات اتر پردیش کی طرف سے ایک حکم جاری کیا گیا ہے جس کا منشا یہ ہے کہ جولائی ۱۹۶۳ء سے شروع ہونے والی سہ لسانی اسکیم میں سنسکرت کو جگہ دی جاوے۔ اس طرح نوے فی صدی اسکولوں میں سنسکرت کے علاوہ بارہ زبانوں کے لئے عملاً کوئی جگہ باقی نہیں رہے گی۔

۱۔ حالات کا سرسری جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کی مجوزہ اور جمہوری حکومت کی تسلیم شدہ پالیسی پر عمل درآمد کرنا سرکاری محکموں کے لئے ایک اصول بن چکا ہے یہ دفتری آمریت ایک خطرناک مستقبل کی طرف نشان دہی کر رہا ہے۔

۲۔ یو۔ پی سررشتۂ تعلیم ایک ایسی زبان کو ریاستی سطح پر مسلط کرنا چاہتا ہے جو یہاں ایک واحد انسان کی بھی مادری زبان نہیں ہے اس زبان کو ہر شہری پر مسلط کرنا ایک غیر جمہوری اور غیر آئینی اقدام ہے

۳۔ سہ لسانی فارمولا کے اغراض و مقاصد کے پیش نظر تین زبانیں اس لئے چنی گئی ہیں کہ ان میں سے دو کو ملکی اور بین الاقوامی رشتوں کو قائم کرنے کیلئے استعمال کیا جاوے تاکہ یہ Link lang. کا کام کر سکیں تیسری زبان ایسی ہونی چاہئے جو مادری زبان کو تقویت پہونچا سکے سنسکرت کو تیسری زبان قبول کرنے کے بعد اپنی دیگر دوسرے صوبوں کی مادری زبان سے بے تعلقی یقینی ہے اور یہ قومی یکجہتی پر ضرب کاری ہوگی۔

۴۔ تعلیمی نظم و نسق اور صوبے کی مالیاتی حالات کے پیش نظر توقع نہیں کی جا سکتی کہ شہروں اور دیہاتوں کے سبھی اسکولوں میں سنسکرت کے اجراء کے بعد کسی دوسری زبان کے لئے موقع نصیب ہوگا۔ اور اگر کچھ مدرسے اردو یا بنگالی وغیرہ کے لئے مخصوص ہوتے بھی تو اس سے جذباتی اتحاد کے بجائے علیحدہ پسندی کی پرورش ہوگی۔ جو اصل مقصد کو فوت کر دیگی

۵۔ سنسکرت کا اجرا لسانی اقلیتوں کو جو خود ہی پسماندہ ہیں مزید پسماندگی کی طرف ڈھکیل دیگا۔ ایک جمہوری نظام کے لئے صورت حال ناقابل برداشت ہوگی۔

۶۔ موجودہ تعلیمی ڈھانچے میں سنسکرت کے لئے ۱۲۰ نمبر اور ہندی کیلئے صرف ۸۰ نمبر ہونگے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یو۔ پی کی زبان کو سنسکرت آمیز ہندی بنا دینا مقصود ہے جو کہ ملکی لسانی پالیسی کے خلاف ہے۔ اور اس کے خلاف وزیر اعظم اور دوسرے لیڈران برابر آواز بلند کرتے رہے ہیں۔ ان حالات میں ہم کو پورا یقین ہے کہ حکومت اتر پردیش کے قدم اس نازک موڑ پر ڈگمگانے سے بچے رہیں گے۔ اور وہ لسانی اقلیتوں کے اعتماد کی حفاظت کرنے کے اہل ثابت ہونگے۔

(اردو کمیٹی الہ آباد)

مہاراشٹر اردو بک سیلرز اوارڈ کمیٹی

مہاراشٹر اردو بک سیلرز اوارڈ کمیٹی کا دوسرا سالانہ جلسہ تقسیم انعامات انجمن اسلام ہائی اسکول ہال میں ۲۰ مئی کو منعقد ہوا۔ ادبی نشست کی صدارت جناب حاتم بھائی اے۔ امیر الدین نے فرمائی۔ جناب سکندر علی وجد اور معین الدین حارث نے اردو ادب اور مراٹھی ادب کے موجودہ رجحانات پر تقریریں کیں اور انعام پانے والے ادیبوں کو سراہا۔

اس کے بعد حکومت مہاراشٹر کے وزیر جناب صالح بھائی عبدالقادر نے مندرجہ ذیل ادیبوں کو اوارڈ انعامات پیش کیے۔

سردار جعفری (دیوان میر) اختر الایمان (یادیں) ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی (اردو غزل ولی تک) عبدالرزاق قریشی (میرزا مظہر جان جاناں) اور سیتھو مادھو راؤ (مراٹھی کتاب اردو کا دیوان چاپ پیچ) [اردو شاعری کا تعارف]

تقسیم انعامات کے بعد شعری نشست میں اصحاب ذیل نے شرکت فرمائی۔

بیکل اتساہی، شعری بھوپالی، جوہر بجنوری، قیصر حیدری، مجروح سلطان پوری، سردار جعفری، اختر الایمان، سکندر علی وجد، انجم صدیقی، باقر مہدی، شوق جاہی، حیدر اسد، سلامت خیرآبادی، عزیز جاوید، ظفر گورکھپوری اور علاء الدین صابر۔

(شاہد علی خاں سکریٹری)

انگریزی کی جگہ کوئی ہندستانی زبان

سوشلسٹ لیڈر ڈاکٹر رام منوہر لوہیا سے ایک نامہ نگار نے دریافت کیا کہ آپ کی ہندی دوستی ملک کے اتحاد کو نقصان نہیں پہنچائے گی۔

اس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ ہندی بھاڑ میں جائے آپ حضرات نے اس معاملہ میں مجھے ہمیشہ غلط سمجھا ہے۔ میں انگریزی کے خلاف ہوں۔ انگریزی کو جانا چاہیے۔ اس کی جگہ کوئی بھی ہندستانی زبان لے سکتی ہے۔ مجھے ہندی کے کٹر حامیوں کے ساتھ جب رکھا جاتا ہے تو مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔

لنکا کی سرکاری زبان

لنکا میں ایک ۹ آدمیوں کی کمیٹی یہ معلوم کرنے کے لیے مقرر کی گئی ہے کہ سنہالی زبان میں سرکاری کام کرنے کے سلسلے میں کتنی ترقی ہوئی ہے۔

تامل بولنے والوں نے سنہالی کو سرکاری زبان بنانے کی مخالفت کی تھی۔

اسکولوں کے داخلہ فارم میں مادری زبان کا اضافہ

نئی دہلی۔ ۲۰ مئی ۵ ریاستوں اور مرکزی نظم و نسق کے ایک علاقہ نے اسکولوں کے داخلہ فارموں میں ایک نئے خانہ کا اضافہ کیا ہے جس میں طلبا کی مادری زبان کا اندراج ہوگا ان میں آسام، مدھیہ پردیش، اتر پردیش، کیرلا، مہاراشٹر اور لنکادیپ وغیرہ جزائر شامل ہیں۔

مدراس نے مطلع کیا ہے کہ اس نے ثانوی اسکولوں کے داخلہ فارم میں اس خانہ کا اضافہ کرایا ہے لیکن پرائمری اسکولوں میں ایسا نہیں کیا۔

حکومت جموں و کشمیر نے مطلع کیا ہے کہ اس ریاست میں لسانی اقلیتیں نہیں ہیں۔

مرکزی وزارت داخلہ کی طرف سے کچھ عرصہ قبل کی جانے والی ایک درخواست کے بعد اب ایک ایسا رجسٹر بھی تعلیمی اداروں میں رہے گا جس میں لسانی اقلیتوں کے طلبا کی درخواستوں کا اندراج ہوا کرے گا۔ لسانی اقلیتوں کے تحفظات کی ایک اسکیم کے تحت ان تمام اداروں میں جہاں کسی خاص زبان کے بولنے والے کم از کم ۴۰ طلبا یا ایک درجہ میں ۱۰ طلبا موجود ہوں گے اسی زبان میں تعلیم کا انتظام کرنا ہوگا۔

لسانی اقلیتوں کے کمیشن نے اپنی رپورٹ میں کہا تھا کہ جب کسی لسانی اقلیت کے طلبا ایک ایک کرکے داخلے کی درخواست دیتے ہیں تو عموماً ان کی درخواستیں یہ کہہ کر مسترد کر دی جاتی ہیں کہ طلبا کی تعداد اتنی زیادہ نہیں ہے کہ اس زبان کے طلبا کا ایک علاحدہ سکشن کھولا جائے اس شکایت کو دور کرنے کے لیے کمیشن نے کہا تھا کہ داخلہ کی تاریخوں سے چند ماہ قبل ایک رجسٹر کھول دیا جایا کرے جس میں لسانی اقلیت کے طلبا کے داخلہ کی تمام درخواستیں درج کی جایا کریں۔

کمیشن نے اپنی تیسری رپورٹ میں یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ اسکولوں کے ذمہ دار داخلہ فارموں میں ایک خانہ ایسا بھی شامل کریں جس میں لسانی اقلیتوں کے طلبا کے سرپرست لکھ دیا کریں کہ وہ اپنے بچوں کو کس زبان میں تعلیم دلانا چاہتے ہیں۔

جنوبی منطقائی کونسل نے ۱۹ اپریل ۱۹۶۳ء کو فیصلہ کیا تھا کہ تمام پرائمری اسکولوں کو نیا تعلیمی سال شروع ہونے سے تین ماہ قبل سے لسانی اقلیتوں کے طلبا کے داخلے اور مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کی درخواستیں وصول کرنی چاہئیں۔ ان تمام درخواستوں کا ایک رجسٹر میں اندراج ہونا چاہیے۔ محکمۂ تعلیم کو اس بات کا انتظام کرنا چاہیے کہ ایسی کوئی درخواست اس بنا پر مسترد نہ کی جائے کہ جس اسکول میں درخواست دی گئی ہے اس میں اس زبان میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کی تعداد ناکافی ہے اور جہاں ضرورت پڑے وہاں لسانی اقلیت کے طلبا کے داخلوں کے سلسلے میں بین اسکولی انتظامات کیے جائیں۔

ان فیصلوں کو بعد میں ریاستی وزرائے اعلیٰ اور مرکزی وزراء کی کانفرنس میں جو اگست ۱۹۶۱ء میں ہوئی تھی عام طور پر منظور کر لیا گیا تھا۔

اودھ پنچ چاہیے

مجھے "اودھ پنچ" لکھنؤ کے شماروں کی ضرورت ہے اگر کوئی صاحب فروخت کرنا چاہتے ہوں تو براہ کرم پتہ ذیل سے ربط فرمائیں۔

رزاق فاروقی کاری سرچ اسکالر ۔۔۔ حیدرآباد ۔۔۔

پتہ دیکھیے ۔ اگر آپ کے پتے کے اوپر سرخ نشان ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس شمارے کے بعد آپ کی میعاد خریداری ختم ہو جائے گی۔ مہربانی فرما کر "ہماری زبان" کا سالانہ قیمت چندہ تین روپے منی آرڈر سے بھیجیے تاکہ یہ سلسلہ جاری رہے۔ (منیجر)

ڈاکٹر رام بلاس شرما

ترجمہ: خاور جمیل پوری

ہندی اُردو میں فرق نہیں ہے؟

کسی قوم کی زبان کے مسئلہ پر غور کرنے سے پہلے ہمیں اس زبان کی عام بول چال کی وضع قطع پر دھیان دینا چاہئے۔ اس سلسلہ میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا عام بول چال کی شکل میں بھی ہندی اور اردو زبانیں علاحدہ علاحدہ ہو جاتی ہیں؟

اس میں شک نہیں کہ یوں تو بولنے کو بہت کٹھن ہندی اور بہت سخت اردو بولی جا سکتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ عوام اس طرح کی سخت زبان استعمال نہیں کرتے اس لئے پریم چند کا یہ خیال نہایت مناسب تھا کہ "بول چال کی ہندی اور اردو تقریباً ایک سی ہے۔"

اردو ہندی قواعد کے ضمیر ایک سے ہیں۔ وہ۔ میں۔ تو، ہم وغیرہ ہندی اردو کے ضمیر یکساں ہیں۔ افعال ایک سے ہیں۔ جانا۔ کھانا۔ پینا۔ مرنا۔ جینا۔ لکھنا۔ پڑھنا۔ وغیرہ تقریباً تمام مصادر ایک ہیں۔ آزمانا۔ گزرنا۔ لرزنا۔ جیسے بہت کم مصادر ملیں گے۔ کل ملا کر ایک درجن سے زیادہ نہیں ہونگے۔ جو فارسی یا عربی الفاظ کی بنیاد پر بنائے گئے ہوں۔ اور وہ بھی ہندی میں متروک نہیں ہیں۔ بول چال میں ان کا استعمال برابر ہوتا ہے۔

ہندی اردو کا تعلق بتانے والے لفظوں میں پر۔ سے وغیرہ اردو کے بھی وہی الفاظ ہیں جو ہندی کے اور ان دونوں کا اصلی مخزن بھی ایک ہی ہے۔ لیکن یہاں بہت دنوں تک حکومت کی زبان فارسی رہنے سے ہندی الفاظ کے فارسی عربی کے ہم معنی الفاظ رائج ہو گئے ہیں۔

جیسے، دیش = ملک۔ آکاش = آسمان۔ دھرتی = زمین کسان = کاشت کار۔ ندی = دریا۔ روگی = بیمار وغیرہ

ان الفاظ کا برتاؤ روزمرہ بول چال کی ہندی اردو میں بغیر کسی فرق اور امتیاز کے ہوتا ہے۔ دیش۔ آکاش۔ دھرتی جیسے ہندی الفاظ اردو ادیبوں کی تخلیقات میں ملیں گے۔ اور ملک آسمان۔ زمین جیسے اردو الفاظ ہندی ادیبوں کی تصانیف میں اس کے سوا۔ ہل۔ بیل کھیت۔ کھلیان بیج۔ جتائی۔ بنائی۔ کارخانہ مزدور۔ کام۔ چھٹی وغیرہ۔ ہزاروں ایسے الفاظ ہیں جن کے ہم معنی الفاظ بول چال کی زبان میں مستعمل نہیں ہوتے صرف کتابی زبان میں ان کا استعمال ہوتا ہے۔

لکھنؤ اور حیدرآباد کے ہندو مسلم بول چال کی زبان میں فارسی الفاظ کا استعمال زیادہ کریں گے۔ انہی فارسی لفظوں کی جگہ بہار۔ مدھیہ پردیش کے مسلمان ہندی لفظوں کا استعمال کریں گے۔ یہ فرق مقامی ماحول کا اثر ہے اس سے دو زبانوں کی تعمیر نہیں ہوتی کیونکہ ہندی اردو کے قواعد ایک، جملوں کی تخلیق ایک سی الفاظ کا خزانہ، افعال اور ضمیر یکساں ہیں۔ اس لئے ہندی اردو کی دو نسلیں نہیں ہیں۔ ان کی ذات اور بول چال کی زبان ایک ہے...... ہندی اردو میں سب سے پہلا فرق دونوں زبانوں کے رسم الخط کا ہے۔ رسم الخط لکھنے کے کام آنے والی چیز ہے نہ کہ بولنے کے۔ اس لئے رسم الخط کے فرق کو ہم بنیادی فرق نہیں مانتے۔ ہندی اردو میں دوسرا فرق ہے۔ الفاظ کے ندرت کا یہ فرق عام بول چال میں بالکل نہیں ہے۔ علم والے طبقے میں بہت تھوڑا ہے۔ اور کتابی زبان میں سب سے زیادہ۔

روزانہ بول چال میں جو لفظ عام طور پر استعمال کئے جاتے ہیں مضامین لکھتے وقت ان سے بھی علحدگی کا رجحان پایا جاتا ہے۔ دھرتی۔ آکاش۔ کسان۔ ندی۔ بھاشا۔ روگی۔ دیش جیسے الفاظ اردو تصانیف میں کم ملیں گے۔ کاشت کار۔ دریا آسمان۔ زبان جیسے الفاظ کتابی ہندی میں کم ملیں گے۔

اس کا بنیادی فرق دوسرا ہی ہے۔ علمی۔ فلسفی۔ سیاسی وغیرہ مضامین میں ہمیں ایسے الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے جو عوامی زبان سے تعلق نہیں رکھتے اور جنہیں اردو کے ادیبوں نے فارسی سے اور ہندی لکھنے والوں نے سنسکرت سے مستعار لے لیا ہے جیسے راج نیتک = سیاست۔ ساہتیہ = ادب۔ لپی = رسم الخط۔ بھاشا وگیان = لسانیت۔ آلوچنا = تنقید انترراشٹریہ = بین الملی۔ اتہاس = تاریخ کوش = لغت اور اسی طرح کے دوسرے الفاظ، ہندی اردو میں تفریق پیدا کرنے والے ہیں۔

پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ہندی اردو کی یہ تفریق ہمارے قومی ارتقا کے لئے نقصان رساں ہے۔ اس سے علم والے طبقے کی دماغی طاقت ایک جگہ سمٹ کر پوری قوم کو آگے بڑھانے کے بجائے بکھر جاتی ہے۔ اور رسم الخط کی بنیاد پر طالب علم طبقہ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ اگر زبان اور ادب اعلیٰ طبقے کے کم تعداد تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے ہی ہو تو وہ چاہے اردو میں تفریح طبع کریں یا ہندی میں۔ باقی عام طبقہ اس دلچسپی سے دور رہے گا...... لیکن سوال یہ ہے کہ ملک کے عام لوگ۔ محنت سے اناج پیدا کرنے والے۔ پنج سالہ سکیم کی تکمیل کرنے والے لوگوں میں جس زبان اور ادب کو مقبولیت حاصل ہو۔ اشتراکی دور میں سب سے پہلے اسی عام طبقے کے لئے تبدیلیاں ہونگی تب یہ زبان اور ادب کا بٹوارہ کب تک چلے گا۔

اشتراکی نظام کی تعمیر کے لئے عوام کی تنظیم اس کی تعلیم اور تحریک بہت ضروری ہے۔ اگر ایک ہی کارخانے کے مزدور دو طرح کے رسم الخط سے کام لیتے ہیں تو اس سے ان کی طاقت کم ہوگی اور ان کی ثقافت میں رخنہ پڑے گا۔ اس کے علاوہ ہندستانی قوم کا شمار دنیا کی سب سے بڑی قوموں میں ہے۔ انگریزی بولنے والے بہت ہیں لیکن وہ مختلف قوموں کے ہیں۔ ایک ہی زبان کا استعمال کرنے والی کوئی قوم اگر ہم سے تعداد میں بڑی ہو سکتی ہے تو وہ چین ہے۔

ایسی حالت میں جب کہ ہماری زبان کو ملکی اور غیر ملکی اہمیت

حاصل ہے تو ظاہر ہے کہ ہماری زبان اپنی پوری طاقت سے تب ہی ترقی کر سکے گی۔ جب اسے قومیت کے تمام عناصر کا تعاون حاصل ہو۔۔۔۔ ہندی، اردو کو ایک ہونا چاہیئے۔ یہ ہمارے تاریخی ارتقائی مانگ ہے۔ اس کے لئے ضروری ثقافتی بنیاد یہ ہے کہ عوام کی بول چال کی زبان ایک ہے۔ ہمیں اس ایکتا کی طرف بڑھنے والے معاشرتی وسیلے نیز ملک کی پس ماندگی اور عوام کی خستہ حالی دور کرنے والے نظام کی ضرورت ہے۔

اس کے علاوہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ہندستان کے ہر صوبے کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی الگ الگ رہ کر ترقی نہیں پاسکتی۔ وہ سارے ہندستان کی زندگی کے چشمہ کی ایک زبردست لہر ہے اور اسے تیز بہاؤ کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیئے۔ یہاں کی زبانیں بھی ایک دوسرے کو متاثر کرتی ہیں، اور کریں گی۔ ہندستان کے قومی صوبوں کی زبان اور رسم الخط علاحدہ ہو سکتی ہے۔ مگر کل ہند کی دو زبانیں اور دو رسم الخط ہونا ممکن نہیں ہے۔

اردو علاحدہ کسی قوم کی زبان نہیں ہے۔ اس لئے اسے علاقائی زبان منوانے کی تحریک قابل مخالفت ضرور ہے۔ مگر یہ قلیل تعداد والوں کی تہذیبی اور ادبی زبان ہے۔ اس لئے اسے پڑھنے پڑھانے اور اس کا استعمال کرنے کی مراعات ملنی چاہیئے۔

سرکاری زبان کی صورت میں ہندی استعمال ہونی چاہیئے کیونکہ راج کاج کیلئے دو رسم الخط اور ان میں لکھی ہوئی دو زبانیں نہیں ہو سکتیں۔

ہندی اردو لغات میں باہم تبادلے کی کافی گنجائش ہے۔ ہندی کی ادبی تصانیف میں عام بول چال کے بہت سے الفاظ چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ بہت سے محاورے، کہاوتیں، روزمرہ بول چال کے الفاظ ایسے ہیں جو اردو کے ہیں۔ لیکن ان کا استعمال ہندی میں نہیں ہوتا۔ کم ہوتا ہے یا غلط طریقے سے ہوتا ہے۔ یہ سب الفاظ اردو سے ہندی میں آئیں گے۔ جب ہماری ادبی زبان زیادہ سہل اور بامحاورہ ہوگی۔

اردو میں سنسکرت کے الفاظ سے جو پرہیز کیا جاتا ہے وہ بھی کم ہونا چاہیئے۔ ہندستانی زبانوں کے لئے عربی فارسی کی وہ اہمیت نہیں ہے جو سنسکرت کی ہے۔ قواعد اور الفاظ کے اصل ذخیرے کے لحاظ سے اردو سنسکرت کنبے کی زبان ہے۔ نہ کہ عربی خاندان کی۔ اس لئے عربی سے اصطلاحی الفاظ لینے کا اصول صحیح نہیں ہے۔

ہندستانی زبانیں صرف سنسکرت کی بنیاد پر اصطلاحی لغات بناتی ہیں اور اردو ان سب زبانوں سے دامن بچا کر اپنی ترقی نہیں کر سکتی۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ وہاں کی زبانیں سندھی، پنجابی، پشتو، بنگالی وغیرہ ہیں اور اردو ان کے حقوق چھین لینے والی سرکاری زبان ہے۔ پاکستان میں اردو کی قومی بنیاد بہت ہی محدود ہے۔ اس میں ذرا بھی شک نہ ہونا چاہیئے کہ سندھ، پنجاب پورب جیسے بنگال وغیرہ صوبوں کی رعایا خود اپنی زبانوں کی حفاظت کرے گی اور ان ہی کے ذریعہ اپنی معاشرتی اور تہذیبی ترقی کرے گی۔

اس لئے اگر کوئی یہ سوچے کہ پاکستان اردو کی حفاظت کرے گا تو یہ اس کا وہم ہے۔ پاکستان بننے سے اتر پردیش کے مسلمانوں کے نہ تو معاشرتی مسائل حل ہوتے ہیں نہ ان کا زبان کا مسئلہ ہی حل ہو سکتا ہے اس لئے اردو کے مسئلہ کا حل اگر کہیں ہے تو اسی ہندی پردیش میں ہے۔ جہاں کے عوام میں اس کی بول چال کا روپ قائم ہے۔

الفاظ کے ذخیرے سے داد و ستد ممکن ہے لیکن رسم الخط میں اس کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اردو سے الف اور ہندی کا سے ای تک ایسے کہ کسی رسم الخط کی تجدید نہیں کی جا سکتی۔ رومن رسم الخط کا سوال نہیں ہے۔ ہم اپنا رسم الخط چھوڑ کر رومن رسم الخط کو نہیں اپنائیں گے۔ اگر رومن رسم الخط کوئی بہت مکمل اور علمی رسم الخط ہوتا تو اس پر غور بھی کیا جاتا۔

ہندی اور اردو کے رسم الخط کو مٹانے کے لئے رومن رسم الخط کو اپنا لینا ایسا ہی ہے جیسے ہندی، تامل، مرہٹی، گجراتی یا بنگلہ آسامی کے جھگڑوں کو مٹانے کے لئے انگریزی کو سرکاری زبان قائم رکھنا۔

اردو رسم الخط کو استعمال کرنے کی آزادی دیتے ہوئے ترقی پسند خیالات کی حمایت کرنیوالوں کو چاہیئے کہ اردو جاننے والوں کو دیوناگری رسم الخط سکھائیں۔ دیوناگری رسم الخط میں اردو کی جتنی کتابیں چھپ رہی ہیں انہیں دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مستقبل قریب میں دیوناگری رسم الخط میں ہی اردو ادیبوں کی کتابیں چھپا کریں گی۔

حرف شناسی کی نشر و اشاعت کے ساتھ اور دکن میں ہندی پرچار کے ساتھ ہندی کتابوں کے لئے ایک بہت بڑا بازار تیار ہو گیا ہے۔ اس لئے یہ ناممکن ہے کہ اردو کے ہوشیار پنجابی ادیب موجودہ حالات سے فائدہ نہ اٹھائیں۔ یہی منافع کی بات ہے کہ اردو میں کتابیں چھپنے سے کم ملیں گی۔ ہندی میں چھپیں گی تو زیادہ ملیں گی۔ یہ ایک طرح کا مالی دباؤ ہے جس سے دیوناگری رسم الخط کو اردو ادیب اپنائیں گے۔ اور اسی طرح معاشرتی زندگی کے حالات کی تبدیلیاں ہندی اردو کو برابر ایک دوسرے کے نزدیک لاتی رہی ہیں۔ سنیما اور ناٹکوں کے لئے لکھنے والے خالص ہندی یا اردو کا خیال رکھیں تو ان کی تخلیقات ناکامیاب ہو جائیں۔

کسانوں اور مزدوروں میں سیاسی کام کرنے والوں کو مجبوراً ایسی سہل زبان استعمال کرنی پڑتی ہے جسے ہندو مسلمان دونوں سمجھ لیں۔ عام تحریکوں کا اتحاد ہندی اردو کی شکلوں پر برابر اثر ڈال رہا ہے۔ اور اسی لئے ہمیں مکمل اعتماد ہے کہ ایکتا کے یہ دونوں روپ اپنے اپنے عناصر سے ایک ہی ادبی زبان کی ارتقا میں معاونت کریں گے۔ (ہندی سے ترجمہ)

نوٹ:۔ ڈاکٹر گیان چند جین)

ڈاکٹر رام بلاس شرما نے اردو کی کایا پلٹ کے جو مشورے دیئے ہیں بظاہر وہ ان کے خلوص نیت اور سوز دل کا نتیجہ ہیں۔ ان کے تحت الشعور میں لسانی اقتدار پسندی کا جو جذبہ مچل رہا ہے مضمون کے نصف آخر میں اس کی بھرپور غمازی ہو رہی ہے۔ پاکستان میں اردو کے بارے میں ان کے جو کچھ مشاہدات ہیں وہ ہمارے لئے غیر متعلق ہیں اشتراکی نظام لانے کے لئے کس قسم کی اردو کی ضرورت ہے ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ہمیں تو آج کے ہندوستان اور اس میں اردو کے مقام سے سروکار ہے۔ ہم اسے ملکی اور بین الاقوامی سیاست میں نہیں گھسیٹنا چاہتے۔

ہندوستان میں کئی طریقہ ہائے فکر ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو پھل پھول رہے ہیں۔ قومی یک جہتی کا صائب طریقہ "کثرت میں یک رنگی کی کھوج ہے۔ غالب نے ایک صدی پہلے ہی اعلان کر دیا تھا۔

ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہئے

وحدت کا دوسرا طریق یہ ہو سکتا ہے کہ ملک کی مختلف کلچروں میں سے قوی ترین کو قائم رکھا جائے اور بقیہ کو اس میں مدغم کرنے کی۔ بالفاظ دیگر فنا کرنے کی کوشش کی جائے۔ ڈاکٹر رام بلاس غالباً دوسرے مسلک کو اپنانا چاہتے ہیں۔

اردو ہندی لسانیاتی اصل کے اعتبار سے ایک زبان سہی لیکن آج اردو اور ہندی دو مختلف ادب ہیں۔ دونوں کا تہذیبی پس منظر مختلف ہے یہاں تک کہ آج ان دونوں کو ایک زبان کہنا حقیقت سے چشم پوشی ہے۔

ڈاکٹر شرما اردو کے بارے میں اعتراف کرتے ہیں۔

"یہ قلیل تعداد والوں کی تہذیبی اور ادبی زبان ہے اس لئے پڑھنے پڑھانے اور اس کا استعمال کرنے کی مراعات ملنی چاہیئے"

(مراعات نہ کہئے حقوق کہئے) یہی تو ہمارا مطالبہ ہے ہم اس سے زیادہ کب چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر شرما جانتے ہیں کہ اگر رومن رسم الخط کوئی بہت مکمل اور علمی رسم الخط ہوتا تو اس پر غور بھی کیا جاتا۔ غرض ہے کہ رومن کی اصلاح شدہ شکل ہیں۔ الاقوامی صوتیاتی رسم الخط اس قدر زیادہ سائنٹفک ہے کہ ہندی تلفظ کو وہ جس قدر صحت کے ساتھ ادا کر سکتا ہے خود ہندی رسم الخط اس کے لگ بھگ نہیں پہونچ سکتا۔ لیکن اس کے باوجود کوئی ہندی کو اصلاح شدہ رومن خط میں لکھنے کی تجویز نہیں کرتا۔ کیونکہ زبان کا معاملہ کیمسٹری کے تجربوں اور ریاضی کے مسئلوں کی طرح محض عقل کا تابع نہیں۔ وہ کسی حد تک جنون سے بھی تعلق رکھتا ہے جس طرح ڈاکٹر رام بلاس ہندی کے لئے ایک زیادہ سائنٹفک رسم الخط اختیار کرنے کی بات سننے کو بھی تیار نہیں۔ اسی طرح ہم اردو کے لئے کوئی غیر اردو رسم الخط اختیار نہیں کر سکتے۔ کیونکہ یہ اردو کے لئے پروانۂ مرگ ہوگا۔

(گیان چند)